سائنس وٹیکنالوجی: ذریعۂ تعلیم یا نتیجۂ تعلیم

گزشتہ لیکچر میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ جب علم زندگی (دنیا وآخرت) کے لیے اس قدر اہم ہے تو اس کے حصول کے لیے کیا کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں۔اس ساری بحث کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ خالقِ علم جس نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے اور اُسے حصولِ علم کے لیے وسائل بھی عطا کیے، جن میں اہم ترین انسانی حواس ہیں (پانچ حسیات جن کا تعلق چھونے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور دیکھنے سے ہے)۔اس کے بعد حواس کی قوتوں کو مزید پروان چڑھانے کے لیے سوچ، فکر اور ادراک کی صلاحیتیں بھی عطا کی گئیں، جن سے علمی ترقی کے عمل کو معاونت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ صلاحیتیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے انسان کو خصوصی طور پر نوازا ہے جو انسانی زندگی اور ہر اعتبار سے اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں تاکہ اسے اشرف المخلوقات کا شرف نبھانے کے قابل بنایا جائے۔ان تمام وسائلِ علم میں سے بہترین اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ ''وحی'' کا ہے، جو انسان کو اپنے نور کی بدولت جہالت کی تاریکیوں سے نجات دیتی ہے۔مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ اس authentic ذریعے کی دستیابی کے باوجود خود وحی بھی پہلے بیان کردہ وسائلِ علم کی نفی نہیں کرتی۔اس نے حواس، عقل اور وجدان کی قوتوں کو کالعدم قرار دینے کے بجائے انہیں نکھارنے اور زیادہ سے زیادہ قابلِ بھروسہ بنانے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ترقی کی منازل کے تعین کے لیے قوتِ تخیل کے استعمال پر بھی کوئی قدغن نہیں لگائی۔

آج جس موضوع پر گفتگو ہوگی، وہ بہت دلچسپ اور اہم ہے--یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی، جس سے جدید دنیائے علم میں مفر نہیں، نتیجۂ تعلیم ہے یا ذریعۂ تعلیم۔آسان سا جواب تو ایک جملے میں پورا ہوسکتا ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کے صحیح ہونے کا اعلان ہی اس کے لیے کافی ہوگا۔مگر یہاں یہ اس لیے مناسب نہیں کہ جس علمی اور عقلی سطح پر گفتگو کی جاری ہے وہاں محض اعلان کافی نہیں بلکہ اس کے لیے کیے گئے تحقیقی اقدامات کے علاوہ اس کے جواز کے حق میں دلائل کے ایک سلسلے کی ضرورت ہوگی۔ بظاہر یہی کہنا آسان لگتا ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم بھی ہے اور نتیجۂ تعلیم بھی۔مگر جیسے جیسے ہم اس موضوع پر گفتگو کو آگے بڑھائیں گے نئی نئی گتھیاں کھلتے کھلتے ہمارے سامنے بے شمار حقائق آشکار ہوں گے۔

سائنس کے لفظ پر غور کیا جائے تو عموماً ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ شاید یہ دو چار مخصوص مضامین ہیں جنہیں ہم نے سائنس کا نام دیا ہوا ہے اور جن میں ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات وغیرہ ہیں۔مگر علم کی دنیا میں بعض اصطلاحات اگرچہ مشہور ہوجاتی ہیں مگر اصل معانی اس وقت کھل کر سامنے آجاتے ہیں جب انسان اس کی تہوں کو تحقیق وجستجو کی نظر سے کھنگالتا ہے۔ جب ہم لفظ ''سائنس'' کو مختلف دانشوروں کی طرف سے پیش کی گئی تعریفات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ عمومی تصور ابھرتا ہے کہ سائنس ایک ''مرتب علم'' (organized knowledge) ہے۔گویا زندگی کے کسی شعبے اور اس کے کسی میدان میں انسان نے کچھ معلومات کو یکجا کیا اور انہیں منطقی ترتیب دی اور ان کی خامیوں کو دور کرتے اور خوبیوں کو مزید نکھارتے ہوئے پیش کرنے کی کوشش جاری رکھی تو وہ معلومات بتدریج علم کی شکل اختیار کرتی چلی گئیں، اور یوں سائنس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ہمارے ہاں اصطلاحات کے استعمال اور ان سے اخذِ معانی میں اکثر غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ یعنی نیچرل سائنس اور اطلاقی سائنس ہی کو ''سائنس'' سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح جب لفظ ''عالم'' کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے (پاکستان

میں) محض دینی عالم ہی مراد ہوتا ہے، مگر عالمی سطح پر عالم کی اصطلاح ماہرینِ مضامین کے لیے بھی ہوتی ہے، خواہ وہ مضامین سائنس سے ہوں یا معاشرت اور دوسرے شعبوں سے متعلق۔ دنیا میں ''سائنس'' کی اصطلاح بنیادی اور اطلاقی سائنس ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ مواد یا مطالعہ سائنس تصور کیا جاتا ہے جس میں تجربات پر مبنی باضابطہ مطالعہ اور مشاہدہ شامل ہو، خواہ اس کا تعلق فنونِ لطیفہ ہی سے کیوں نہ ہو۔

عرب دنیا میں سائنس دانوں کے لیے بھی لفظ ''عالم'' استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس کے موضوعِ مہارت کا تذکرہ لفظ عالم کے لاحقے کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً طبیعیات کے عالم کو عالمِ طبیعیات کہہ دیا جاتا ہے۔ عرب دنیا کے کسی شہر میں آپ کو کسی ادارے پر ''کلیۃ العلوم'' کا بورڈ نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ وہ ''سائنس کالج'' ہے۔

علم اپنے وسیع المعانی دائرے میں ہر شے کو سمو لیتا ہے۔ چنانچہ ''سائنس'' کی وضاحت کرتے ہوئے اسے چند بنیادی یا اطلاقی سائنسوں تک محدود کر دینا درست نہیں۔ جس طرح اللہ کی یہ کائنات وسیع ہے، اسی طرح علم کا دائرہ بھی وسیع ہے، یا جس طرح انسان کے سارے اعضاء و جوارح مل کر ایک مکمل انسانی وجود کی تکمیل کرتے ہیں، اسی طرح تمام شعبہ ہائے حیات کی باضابطہ تحقیق کو یکجا کرنے سے علم کی تشکیل ہوتی ہے۔ البتہ اس کا مکمل ہونا مشکوک ہے، کیونکہ ابھی تک بنی نوع انسان نے عمومی کاوشوں کے باوجود کائنات کے علم کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں کیا۔ یہاں سائنس کے وسیع کینوس پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ تمام افراد جو الہامی علوم پر دسترس حاصل کرتے ہوئے مزید تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں (فرض کر لیجیے) مہارت تامہ (جو محض ایک تصور ہے) حاصل کر لیتے ہیں، اُنہیں الہامی علوم (revealed knowledge) کے علماء کہا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال معاشرتی سائنسوں کی بھی ہے۔ اخلاقیات، بشریات، ادبیات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ معاشرتی علوم کہلائیں گے۔ اسی طرح بنیادی سائنسوں میں طبیعیات، کیمیا، فلکیات، حیاتیات وغیرہ، جن کے اندر بیسیوں ذیلی اور اطلاقی میدان ہائے علم ہیں، شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ تمام عقلی علوم جو rational sciences کہلاتے ہیں، سائنس ہی کے دائرے میں آتے ہیں۔ اطلاقی سائنسوں میں انجینئرنگ، طب حیوانیات، کمپیوٹر سائنس اور لائبریری سائنس وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ پس علمی ترقی کی خواہش رکھنے والے افراد پر لازم ہے کہ وہ سائنس اور علم کے مفہوم کو محدود ہرگز نہ کریں، ورنہ وہ اپنی منزل کے تعین میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

اسی طرح جب لفظ ''عالم'' استعمال ہو تو اس سے لازماً دینی علوم کا ماہر مراد نہیں ہے، بلکہ اس کے ذیل میں سائنس دان، فلاسفر اور مفکر بھی آتے ہیں۔ خواہ ان کا تخصص کسی بھی میدان میں ہو۔ وہ عالم بھی ہیں اور معلم بھی۔

سائنس کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت ہو تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ مادہ، اسکی مختلف نوعیتیں، مادے سے توانائی کے تعلق، مادے کی کیمیائی ساخت اور ترکیب نو کے امکانات سے لیکر مادے سے زندگی کی نمو اور زندگی کے مادی معاملات و مسائل کے متعلق جس قدر معلومات اور تحقیقات ہوں گی وہ سائنس کے دائرے میں آئیں گی۔ یہاں تک کہ ان معاملات پر تحقیق و تدوین کرنے والے ذہن کی ساخت اور اس سے متعلق مسائل بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ ذہنی ساخت اور اس کے تعاملات میں تخیل، تفکر اور فہم و ادراک سے متعلق تمام معاملات بھی سائنس کے مطالعے کے ذیل میں آتے ہیں۔ گویا طبعی، حیاتیاتی اور نفسیاتی تمام علوم سائنس کے دائرۂ تحقیق میں آتے ہیں۔

اسی امر کو ذرا ایک اور زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ تمام تر علوم کا مشترک اور اہم ترین مقصد یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں توازن قائم نہ رہے تو اُس گوشے کو متوازن کیسے کیا جائے؟ یعنی جب بھی کوئی شخص غیر متوازن معاملاتِ حیات کو متوازن بنانے کی کوشش کرتا ہے تو گویا وہ علم کی راہ پر چل پڑتا ہے اور جس میدان میں جس معیار پر وہ توازن کے لیے تحقیق و جستجو کرتا ہے، اُسی معیار پر اس کی پہچان ہوتی ہے۔

انسانی زندگی میں جسمانی لحاظ سے کوئی عدم توازن کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، چاہے وہ خون کے ایک قطرے کی کیمیائی ترکیب میں ہو یا اس کے نظامِ گردش میں کوئی خرابی (عدم توازن) ہو تو میڈیکل سائنس سے تعلق رکھنے والے افراد اس کی تصحیح کریں گے۔ وہ اپنی تحقیق کے ذریعے اس عدم توازن کی وجوہات پر روشنی ڈالتے اور اس کے تدارک کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ سارا تحقیقی سلسلہ علم طب کی تشکیل کا سبب بنا۔ اسی طرح زمین کی اندرونی ساخت، پہاڑوں کی تشکیل اور تبدیلی، زمین کی زرخیزی، اس کے عوامل واثرات وراندرون ارضی تبدیلیوں کے تمام معاملات پر مشتمل علمِ ارضیات بنتا ہے۔ ایسے علوم جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر زندگی سے متعلق یا اس پر اثر انداز ہوتے ہیں، زندگی کا اصل حسن اور مقصدِ حیات بن سکتے ہیں (کیونکہ ان سے کسی نہ کسی طرح زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں) اور ڈاکٹر انعام الرحمٰن کے بقول ''اس بڑی کائنات میں انسان اگرچہ بظاہر ایک حقیر ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے، مگر اپنی ذات میں ایک مکمل کائنات ہے'' [اس کے دل میں کائنات کی وسعت پائی جاتی ہے]۔ جس طرح انسان کی زندگی کو متوازن کرنے کے لیے مختلف علوم وجود میں آتے ہیں اسی طرح کائنات کی تبدیلیوں کے نتیجے میں (جن کے انسانوں کے مسکن کرّۂ ارض پر اثرات مرتب ہوتے ہیں) کچھ لوگ فوری طور پر تحقیق وجستجو کا آغاز کر دیتے ہیں اور یوں آئے دن نئے نئے مضامین وجود میں آنے لگتے ہیں۔ جب وہ کرّۂ ارض کے بیرونی خول اور اندرونی ساخت کے عدم توازن کے نتیجے میں آنے والے زلزلوں پر غور کرتے ہیں تو نئے علوم کی بنیاد پڑتی ہے اور آتش فشانی کے مظاہر پر تحقیق ہونے لگتی ہے، جس کے نتیجے میں تحقیق وجستجو کے نئے نئے راستے کھلتے ہیں۔ ایسے لوگ جب ان موضوعات پر مزید تحقیق کرتے ہیں تو اُنہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فلک بوس پہاڑ اپنی تمام تر ظاہری گھمبیرتا کے باوجود اندر سے آتش بجان ہیں۔ ہمارے آس پاس چلتے پھرتے لوگ بھی ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں کہ جو بظاہر خاموش ہیں مگر ان کے اندر نجانے کیسے کیسے طوفان برپا ہوتے ہیں۔ جو جذبات کے بھی ہوتے ہیں اور خیالات کے بھی۔ بظاہر خاموش فرد اس اندرونی خلفشار اور جذبات کی آگ کی بدولت کسی وقت بھی آتش فشاں ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اپنے اپنے تصور کے مطابق زندگی کے جس میدان کو بھی کسی فرد نے توازن کے لیے منتخب کر کے اس میں تحقیق وجستجو کی راہ اپنائی وہ آخر کار اس کا ماہر بن گیا۔ گویا وہ علم اس کی سائنس قرار پایا اور وہ فرد اس میدانِ علم کا سائنسدان قرار پایا۔ اس لیے کسی بھی شعبۂ علم میں سائنسی طرزِ فکر سے مطالعہ کرنے کا اولین مقصد یہ جاننا ہے کہ شخص (فرد) کی ذات، اس کے ماحول، عالمِ انسانیت اور اس سے بڑھ کر کائنات میں جہاں جہاں عدم توازن کا احساس ہوتا ہے اُسے توازن آشنا کرنے میں افراد کیا رول ادا کر سکتے ہیں۔

اس مرحلے پر پہنچتے ہی ایک نکتہ ہماری توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ وہ یہ کہ کائنات خود ہر لمحے تغیر پذیر ہے یا دوسرے معنوں میں ترقی پذیر ہے۔ کبھی جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہیں ہوگا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ کا مطالعہ کریں تو معانی کی کئی تہیں کھلتی محسوس ہوتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہر دن جو طلوع ہوتا ہے، وہ پکارتا ہے، اے آدم کی اولاد! میں ایک نئی مخلوق ہوں اور تیرے عمل پر گواہ۔ مجھ سے کچھ حاصل کر لے، اس لیے کہ جانے کے بعد میں قیامت تک واپس نہیں آؤں گا۔

گویا ہر نئے دن کو اللہ تعالیٰ ایک نئے مزاج کے ساتھ تخلیق فرماتا ہے۔ چنانچہ ہر نئے دن کی طرف سے ایک اعلان جاری ہوتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ وہ دن کہتا ہے: ''انا خلقٌ جدید۔ وانا علیٰ عملک شھید'' (میں ایک نئی مخلوق ہوں اور تمہارے عمل پر گواہ ہوں) جب میں چلا جاؤں گا تو پھر لوٹ کر نہیں آؤنگا۔ واضح رہے کہ یہ دن کی بات ہو رہی ہے، سورج کی نہیں۔ سورج اور چاند تو مقرر کیے ہوئے راستوں پر گامزن ہیں ہی۔ یہ تاریخ کے دھارے میں مسلسل ایک طرف رواں اور بہتے ہوئے ایک دن (یوم) کی بات ہے جو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ جو لمحے ماضی بن جاتے ہیں حال میں لوٹ نہیں سکتے۔

ہم چاند اور سورج کو مسلسل محوِ سفر پاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمیشہ سے اسی طرح ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دن نئے واقعات لے

کرآتا ہے اور اس کی ایک تاریخی انفرادیت ہوتی ہے۔ اسی صورت میں تاریخ کے دھارے کے مسلسل سفر کا ادراک ممکن ہے۔ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مربی اور راہنما ہیں اس لیے دن کے بارے میں فرمایا کہ وہ تمہارے اعمال پر گواہ بھی ہے اور تبدیلی اور ترقی کا پیغام بھی، جو کائنات کی تغیر پذیری کا مظہر ہے۔ اب چونکہ کائنات کی تغیر پذیری کا ادراک ہو جائے تو کائنات سے متعلق علوم میں تغیر اور ترقی سے انکار کیسے ممکن ہے۔ گویا پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں، حیوانوں، انسانوں، نباتات اور جمادات میں ہر لمحے تغیر پر یقین کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ خالق کائنات نے اس کی تخلیق ایسے انداز میں کی ہے کہ تغیر اور ترقی اس کے وجود کا حصہ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا انکشاف اس میں تبدیلی کی روح پھونک کر کرفرمایا ہے۔ اس آیت کریمہ پر غور کیجیے:

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ　　(الذاریات: ۴۸)

(آسمانوں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں)

چنانچہ یہ طے ہے کہ کائنات کی گردش کا دائرہ محدود اور مقرر نہیں بلکہ اس میں مسلسل وسعت آرہی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت انسان اس قدر بالغ نظر نہ ہوا تھا کہ وسعت کے اس تصور کو سمجھ سکے۔ مگر آج انسان کائنات کی وسعتوں کو اپنی تحقیق وجستجو کا ہدف قرار دے چکا ہے۔ لہٰذا اس پیغام کا مفہوم سمجھنا اس کے لیے مشکل نہیں رہا۔ یہ کلامِ مقدس کا اعجاز ہے کہ وہ انسان کی راہنمائی ہر دور کی علمی ترقی کی مطابقت سے کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس پیغام کو سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ کائنات ہر لمحے وسعت پذیر ہے۔ آج کے جدید علوم کے ماہرین اس سے مکمل طور پر متفق ہو چکے ہیں جو کچھ کلامِ مقدس میں پندرہ صدیاں قبل فرما دیا گیا تھا۔ اب کائنات کے تصور میں ٹھہراؤ اور یکسانیت کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس لیے اگر کائنات میں قرار نہ ہو تو انسان کے علم میں ٹھہراؤ کیسے ممکن ہے۔ انسان چونکہ خالقِ کائنات کی لامحدود ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس کے علم میں مسلسل توسیع میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ سورۃ الرحمٰن کی اس آیت کی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کیجیے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ　　(الرحمٰن:۲۹)

(اللہ کی ذات وہ ہے کہ ہر دن ایک نئی شان اور نئے کام میں مصروف نظر آتی ہے)۔

یعنی اس میں بھی یہی مفہوم ہے کہ تخلیقِ کائنات کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کُن کہہ کر کائنات تخلیق کر دی تو اب فارغ ہو کر کرسیٔ عرش پر متمکن ہے، بلکہ آج بھی ''آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون'' (اقبال)

یہ جو کائنات روز نئے نئے رنگ اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہے، یہ خالقِ مطلق کی تخلیقِ مسلسل کا مظہر ہے۔ لہٰذا انسان کائنات پر جس قدر تحقیق وجستجو اور غور وخوض کرے گا، نئی نئی صورتیں منصۂ شہود پر آتی جائیں گی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہ صرف غور وفکر کی صلاحیت دی ہے بلکہ اس کے مسلسل استعمال کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والی مسلسل تبدیلیاں اور انقلابات انسان کو غور وفکر پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر تبدیلی کا عمل کہیں رُک جائے اور کل کی معلومات آج اور آج کی معلومات آئندہ نامعلوم مدّت تک کافی ہونگی (اور شاید علم میں وسعت کی ضرورت نہ رہے)۔ مگر ایسا نہیں ہے اور زندگی کی مسلسل تبدیلی فکرِ مسلسل کی متقاضی ہے۔ آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ کل کی حاجتیں آج اہم نہیں رہیں، اور آج کی ضرورتیں آئندہ اہمیت کھو سکتی ہیں۔ کل گھوڑوں اور خچروں پر سفر کیا جاتا تھا، مگر آج انہیں پَر لگ چکے ہیں اور فضائے بسیط انسان کی دسترس میں ہے۔ کل علاج معالجے کے لیے جڑی بوٹیوں پر انحصار کیا جاتا تھا تو آج ان کے جوہر تلاش کیے جا چکے ہیں اور یہ جواہر نباتات کی بجائے جمادات سے بھی (کیمیائی ترکیب کی صورت میں) حاصل کیے جا رہے ہیں۔ اور یوں علاج کے متنوع طریقے دریافت کیے جا چکے ہیں۔ اور جب سے انسان اس دنیا میں آباد ہوا ہے، اس میں مسلسل اضافہ جاری ہے۔

ذرا غور کریں تو احساس ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے غور وفکر کی صلاحیت صرف انسانوں کو عطا نہیں کی بلکہ اس کائنات کی ہر شے کو کسی نہ کسی

طرح سے صلاحیتِ فکر عطا کی گئی ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے مدارجِ فکر میں تفاوت ضرور ہے۔ اس طرزِ فکر کے معیارات بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ انسان کی صلاحیت اور معیارِ فکر تمام مخلوقات سے بہتر ہے۔ اس آیت پر غور فرمائیے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ　　(الجمعۃ:۱)

(اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔)

تسبیح بیان کرنے کے لیے یقیناً کچھ نہ کچھ صلاحیتِ فکر کا وجود ضروری ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوا: ''یہ جو بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں، دراصل یہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔'' گویا ان کے اندر بھی کسی نہ کسی شکل میں صلاحیتِ فکر موجود ہے۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ زمین میں ڈالا گیا بیج کا ایک دانہ زمین کی تاریک تنہائی میں غور وفکر کرتا ہے۔ اور جب اُسے ادراکِ ذات ہو جاتا ہے تو فرطِ مسرت سے سطحِ زمین سے پھوٹ نکلتا ہے۔ گویا پھر وہ ماحول میں خاموش اعلان کرنے لگتا ہے کہ مجھے ادراکِ ذات حاصل ہو گیا اور میرا تعارف وہ ہے جو میرے وجود اور پتوں کے رنگ وشکل سے جھلکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پھولوں کے رنگ اور پھلوں کے ذائقے تک ہر خاصیت متعارف اور منکشف ہو چکی ہے۔ اس ادراکِ ذات کا نتیجہ ہے کہ وہ پودا بلا امتیاز اپنے سائے، پھولوں اور پھلوں سے تمام مخلوقات کو مستفید کرنے لگتا ہے۔ انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، بلکہ انسان عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں تاوقتیکہ ان کی سوچ میں کوئی بے قاعدگی (abnormality) پیدا نہ ہو جائے۔

اس کائنات کی عظیم ترین ہستی یعنی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلانِ نبوت سے قبل غارِ حرا کی تنہائیوں میں سالہا سال تک کارخانۂ قدرت میں غور وفکر فرمایا اور یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ ماحول میں موجود عدم توازن کو توازن میں بدلنے کا عمل کہاں سے شروع کیا جائے اور اسی دوران معراجِ فکر کی منزلیں طے کرنے کے بعد معراجِ عرش تک پہنچے۔ بقولِ شاعر

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یعنی انسان بھی جب غور وفکر کی عادت کو اپنائے گا اور اس صلاحیت کی تقویت کے لیے غور وفکر کے ذریعے روحانی مشقوں میں سے گزرے گا تو اُسے جو معراجِ فکر میسر آئے گا اس کے ذریعے وہ فلاحِ انسانی کے لامحدود ذرائع کی دریافت کر سکے گا اور وہ اپنے دائرۂ مہارت میں درجۂ کمال تک جا پہنچے گا۔

جیسا کہ ذکر ہو رہا تھا کہ کائنات من جملہ بھی اور اسکے اندر مختلف انواعِ حیات بھی مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ اس کی روشنی میں بنیادی سائنسوں یعنی طبیعیات اور کیمیا یا حیاتیات وغیرہ کے ماہرین (سائنسدان) مسلسل تحقیق کے بعد نئے نئے نظریات انسان کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کائنات میں مسلسل تغیر اور ترقی کی ایک روشن مثال ہے۔ یعنی کبھی جوہر یا ایٹم کے بارے میں خیال تھا کہ یہ مادّے کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے، مگر آج کا سائنسدان ایک جوہر (ایٹم) میں نظامِ شمسی کی طرح کا نظام دریافت کر چکا ہے اور اس تصور میں مسلسل وسعت آ رہی ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ مادّے کی ہر نوع سے متعلق بنیادی ذرات ایک جیسے ہیں مگر اب یہ خیال بھی بدل چکا ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ کائنات کے طریق ہائے کار (مظاہرِ فطرت) متعین اور کیفیتِ جبر میں ہیں، اور کائنات آفاقی توانائی کے ساتھ مسلسل چلتی جا رہی ہے، اور آئندہ بھی چلتی چلی جائے گی۔ اور ممکن نہیں ہے کہ کبھی تھم سکے۔ مگر اب یہ واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ اس حرکت کے پیچھے کارفرما قوت کے اختتام کے نتیجے میں یہ حرکت تھم سکتی ہے اور یوں زندگی کا وجود معدوم ہو سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مادہ اور توانائی کو ایک دوسرے کی ضد (opposite) سمجھا جاتا تھا۔ یعنی مادہ توانائی اور توانائی مادہ نہیں ہو سکتیں۔ اب یہ خیال مکمل طور پر ردّ ہو چکا ہے اور آج کا ماہر طبیعیات و کیمیا یہ یقین رکھتا ہے کہ مادہ توانائی میں اور توانائی مادّے میں بدل سکتی ہے۔ مگر یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ تبدیلی کائنات کا نقص نہیں بلکہ حسن ہے۔ اسی حسن کو قائم رکھنے کے لیے دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے۔

اس تبدیلی کو واضح کرنے کا کام مفکرین، محققین اور معلمین کا ہے۔ اسی حوالے سے یہ مشاہدہ مفید ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک مطالعۂ سائنس استقرائی (inductive) تھے۔ یعنی مثالوں کو جمع کر کے قوانین وضع کیے جاتے تھے۔ مگر بعد میں نظریہ اضافت کو جاننے کے لیے فلسفیانہ طریقہ اختیار کیا جانے لگا۔ جبکہ فلسفے کا تعلق عقل اور غور وفکر کی صلاحیت کے ساتھ ہے۔ یہ مسلسل تبدیلی ہی کا شاخسانہ ہے کہ انسان کے علم میں مسلسل ایسے حقائق آتے چلے گئے جن کے بارے میں وہ اب تک اندھیرے میں تھا۔ دنیا میں رہنے والے کسی شخص کی دعاؤں سے اس کی زمین ہری بھری نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لیے ایک نظام وضع فرما رکھا ہے کہ جو محنت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ترقی دے گا اور اُسے محنت کے ثمرات میسر آئیں گے۔

اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ یونانیوں کے زمانے سے محنت اور اس کے ثمر کے حوالے سے یہی طرزِ فکر رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم انسان اگرچہ وسعتِ ظرف کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ذرا سا اپنے دل میں جھانک کر دیکھیں تو ادراک ہوگا کہ ہر انسان نے اپنے اندر ایک دنیا بسا رکھی ہے اور وہ اس کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اس میں تبدیلی کی نہ وہ جرأت کرتا ہے اور نہ ہی پسند کرتا۔ بلکہ اس سلسلے میں بہت متشددانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے اپنے نظریات پر اس حد تک انتہا پسندی کے ساتھ مستحکم ہیں کہ کسی اور کے نظریۂ حیات کو تنقیدی نظروں سے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ یہی کیفیت عصبیت کہلاتی ہے، جس کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید الفاظ میں مذمت کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تعصب حصولِ علم کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ کیونکہ وہ انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ اور یوں انسانی ترقی کے بے شمار راستے بند ہو جاتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: ''سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو خود کو سب سے بڑا عالم سمجھتا ہو۔'' اور اس کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ جب انسان خود کو سب سے بڑا عالم و فاضل سمجھنے لگے تو گویا نادانستہ طور پر علم و عرفان کے لیے اپنے قلب و دماغ کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ مسلمانوں نے جب سے دین اور دنیا میں تفریق کا ارتکاب کیا، تب سے وہ اخلاقی اور مادی تنزلی کا شکار ہیں۔ جب تک یہ تفریق وجود میں نہیں آئی تھی، اُمّتِ مسلمہ ''خیر اُمت'' کے منصب پر فائض رہی۔ گویا یہ سوال بنی نوع انسان کے سامنے مدّتوں پہلے سے لے کر آج تک موجود ہے کہ کیا مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے خلاف ہیں؟ مختلف افراد نے اس حوالے سے متفرق بیانات دیے ہیں۔ رویوں سے بھی اس بارے میں نقطۂ نظر کا علم ہو جاتا ہے۔ دینی تعلیمی اداروں اور کالجوں یا یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی یہ اظہار کیا جائے کہ مذہب اور سائنس باہم متصادم نہیں ہیں، بلکہ ان کا روح اور بدن کے تعلق کی طرح چولی دامن کا ساتھ ہے، تو دونوں مکاتبِ فکر اصولی طور پر اس سے متفق ہو جاتے ہیں، لیکن جب گفتگو مفصل ہونے لگے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ ''اخلاقیات'' کی تعلیم کو غیر ضروری قرار دینے لگتے ہیں۔ اسی طرح حدیث، فقہ اور علومِ قرآنی میں مہارت حاصل کرنے والے سائنسی معلومات سے خود کو بے نیاز قرار دیتے ہیں۔ گویا انہیں زندگی اور اس کی احتیاجات میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ یہ سب اسی تصور کا شاخسانہ ہے کہ ہر فرد نے اپنے اندر ایک دنیا قائم کر رکھی ہے اور محض تقابل کے لیے بھی اس دنیا سے باہر جھانکنے کی جسارت نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ کسی کو اس بارے میں اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کے نقطۂ نظر پر ناقدانہ نظر ڈال سکے۔ دنیا اور دین دونوں معاملات میں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں ایک لحاظ سے انسان کہیں زیادہ متشدد تھا کہ قتل و غارت گری کی صرف یہ وجہ نہیں ہوتی تھی کہ مقتول کے قاتل سے کوئی سیاسی یا مذہبی اختلافات تھے بلکہ محض اس وجہ سے بھی قتل کا جرم سرزد ہو جاتا تھا کہ مقتول نے قاتل کے نظریے سے اختلاف کی جرأت کی تھی اور کسی نئے نظریے کو متعارف کرانے کی جسارت کی تھی۔ لہٰذا جب بھی کوئی کسی نئے نظریے کو متعارف کرانا چاہتا تو پہلے کے نظریات کے پیروؤں کو ایک انجانا خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ نئے نظریے کو رد کر کے اس کے پیشکار کو قتل کرنے سے نہیں گھبراتے تھے، خواہ وہ نظریہ کتنا ہی قرینِ حقیقت کیوں نہ ہو۔

برصغیر میں جب پہلے پہل لاؤڈ سپیکر متعارف ہوا اور علمائے اسلام سے اس کے استعمال کے جواز یا عدم جواز سے متعلق فتویٰ لینے کی کوشش کی گئی تو بہت سے علماء نے محض عدم واقفیت کی بناء پر اسے ''صوت الشیطان'' قرار دے کر اس کے استعمال کی ممانعت کر دی۔ اسے واضح طور پر مخرب اخلاق قرار دے دیا گیا۔ مگر آج دیکھیے کہ جس طبقے نے اس کے خلاف فتویٰ دیا تھا وہی سب سے زیادہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اب انہیں یہ ادراک حاصل ہو گیا ہے کہ دور دور تک آواز پہنچانے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

آج سے چند سال قبل کسی عالم کے گھر میں ریڈیو، ٹی وی کے وجود کا تصور بھی محال تھا۔ لیکن اب ہر عالم اس امر میں کوشاں بھی ہے کہ نہ صرف ٹی وی اس کے گھر میں آئے بلکہ وہ خود بھی ٹی وی میں جائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکے۔ مختلف خیال کے افراد میں یہی صورتِ حال ظاہر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ بہت قدیم زمانے میں، جب یونان تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہوا کرتا تھا، سقراط کے حوالے سے دیکھنے میں آتی ہے۔ ابھی زندگی تہذیب کی راہ پر چند قدم ہی چل پائی تھی کہ اُسے زہر کا پیالہ محض اس لیے پینا پڑا کہ اُس نے (کتنی ہی سچی اور کھری سہی) مگر عام چلن سے ہٹ کر بات کی تھی۔ لوگوں نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ انہیں اپنی معمول کی ڈگر سے نہ ہٹایا جائے۔ جب اس طرح کے رویے تاریخِ انسانی میں ایک تواتر کیساتھ ظاہر ہوتے رہے تو یورپ میں ایک خطرناک ردّعمل سامنے آیا، جس کے مطابق لوگوں نے مذہب سے یکسر بیزاری کا اظہار کر دیا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے مذہب کے کلی انکار کی جرأت نہیں کی، مگر انہوں نے بھی اسے چرچ کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور فرد کو مکمل آزادی دے دی کہ وہ چاہے تو مذہب کو اپنائے اور چاہے تو اس سے بے نیاز رہ کر زندگی گزار دے۔ اسی حوالے سے علامہ اقبال نے کہا:

تعلیمِ پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ　　ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

یعنی ان میں سے بہت سوں نے ''ہستیٔ غائب'' یعنی خود خالقِ کائنات کے وجود سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ پانچوں حسیات (سماعت، بصارت، شامہ، لمس اور ذائقہ) سے باہر کی باتوں کا ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ ان کی محدود نظری اور کوتاہ اندیشی کا شاخسانہ تھا۔

محسوس پر بنا ہے علومِ جدیدہ کی　　اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
کہتا ہے مگر فلسفۂ زندگی کچھ اور　　مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش!
باہر کمال اندکِ آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اگر تمہیں بے حد وحساب علم حاصل ہو جائے، یہاں تک کہ تم علمِ کل کے مالک بھی ہو جاؤ، مگر تمہیں کچھ ایسی باتوں سے ضرور سابقہ رہے گا جن کا تعلق علم سے نہیں بلکہ جذبے اور جنون سے ہوتا ہے، جو انسان کے دل میں عشق کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور اس کا عقل سے یہ تعلق ہے کہ:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ممکن ہے آج کسی فرد کو اس جذبے کا ادراک ہی نہ ہو، مگر کل وہی اس کی زندگی کی راہیں متعین کر رہا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے عشق ایک فرد کے لیے ناقابلِ فہم ہو، مگر کل جب وہ خود اس جذبے کی گرفت میں ہوگا تو اسے اس کی شدت اور نوعیت کا ادراک ہوگا۔ اس وقت اندازہ ہوگا کہ ایسے حقائق وجود رکھتے ہیں کہ عقل جن سے انکاری ہو تو ہو، جذبہ ان کے وجود پر ایمان رکھتا ہے۔ مثلاً ایک ماں اپنے بچے کے لیے کیسے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ ایک باپ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے اپنی کل کائنات نچھاور کر دیتا ہے۔ اسے صرف جذبہ سمجھ سکتا ہے، عقل نہیں۔ کیونکہ مادّی معیشت میں یہ دونوں بظاہر گھاٹے کے سودے ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جنون اسی لیے خرد پر حاوی ہے کہ یہ معاملہ نفع ونقصان سے انسان کو بلند تر کر دیتا ہے۔

اس حوالے سے چند آیات کا مطالعہ راہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس میں اس سوال کا جواب بھی ہے کہ آیا سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے معاون ہیں یا مخالف؟ چنانچہ مذہب اور سائنس کے خالق سے پوچھنا پڑے گا کہ سچ کیا ہے؟

قُلْ أَإِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهٗ أَنْدَاداً. ذٰالِکَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ. وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَکَ فِیْهَاوَ قَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِی اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ (فصلت:۹،۱۰)

(اے نبیؐ! ان سے کہو، کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہم سر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا ربّ ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے۔ اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب وحاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔)

پہاڑوں کے بارے میں ہم پڑھتے چلے آ رہے ہیں کہ جہاں کبھی سمندر خشک ہو جائے تو زمین کی تہیں ابھرنے لگتی ہیں اور آخر کار پہاڑوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور جہاں سمندر راستہ بنا لیتا ہے وہاں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے انقلابات کرۂ ارض کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ ''اللہ نے پہاڑ اوپر سے گاڑے ہیں''، اور آج کی سائنس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس آیت میں ایک اور قابلِ غور نکتہ بھی ہے، یعنی زمین میں برکت اور رزق کا سامان موجود ہونا۔

گویا اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف حصوں میں جو رزق محفوظ کیا ہے، یہ سائنس بلکہ خود انسان کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ کیونکہ دیگر مخلوقات کے لیے مخصوص کیے گئے رزق کو آشکار کر دیا ہے اور ان کا رزق ویسے بھی محدود کر دیا ہے۔ جو پرندے کیڑے مکوڑوں پر گزارہ کرتے ہیں ان کا رزق وہیں تک محدود ہے۔ گھاس چرنے والے جانور عمر بھر گھاس سے شغف رکھیں گے۔ گوشت کھانے والے درندے گاس نہ کھا سکیں گے۔ مگر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف رزق میں تنوع رکھا ہے بلکہ اس کے ذوق میں تبدیلیوں کی گنجائش بھی رکھی ہے۔ اور دیگر حیوانات کی طرح انسان کا رزق آشکار نہیں کیا بلکہ اسے فطرت کی تہوں میں مستور رکھا ہے اور فراہمی کے لیے انسان کی تگ و دو کو شرط قرار دیا ہے۔ ہاں اس کے لیے انسان کو صلاحیتِ عقل دی، جس کے استعمال سے وہ اس تلاش کو آسان بناتا ہے۔ یہاں یہ خیال پھر سے ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان کو چونکہ مٹی سے (یعنی زمین سے) بنایا گیا ہے تو اس کی خوراک میں بھی زمین کی متنوع اقسام کی طرح بے پناہ تنوع رکھا گیا ہے۔ اور اس کے رزق کو جس جس انداز میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، اور اسے تلاش کرنے میں انسان جو جو طریقے اختیار کرتا ہے، وہی اس کا ذریعۂ معاش، بلکہ اس کی سائنس کا میدانِ تحقیق بھی قرار پاتا ہے۔ اس طرح طب، صنعت، زراعت اور ٹیکنالوجی جیسے میدانہائے علم میں مسلسل تحقیق جاری رہتی ہے۔ اور اس حکمت پر بھی غور کیجیے کہ دو دن میں اللہ رب العزت نے زمین بنائی اور دو دن خاص طور پر اس میں رزق رکھنے میں صرف کیے تو اربعة ایام کا مطلب سمجھ میں آیا۔ اس مرحلۂ فکر پر یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ یہ دو دن وہی ہیں جو زمین کی مداری یا محوری گردش کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں؟ تو مفسرین اس کا جواب دیتے ہوئے اس کی نفی کرتے ہیں کہ چونکہ معاملہ تخلیقِ کائنات کے حوالے سے سامنے آیا ہے، اس لیے ان دو دِنوں سے وہ دن مراد نہیں جو زمین کی محوری اور مداری گردش کے نتیجے میں ظہور میں آتا ہے۔ بعض مفسرین اس سے دو مرحلے مراد لیتے ہیں۔ جبکہ ان کے نزدیک یہ مرحلہ ہزارہا سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ ایک دن اللہ کے ہاں ایسا ہے کہ جو زمینی گردش کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ مگر رزق کو تخلیق کر کے اسے زمین میں مستور کر کے انسان کو اس کی تلاش پر اکسایا، تاکہ ہر فرد اپنی صلاحیت اور تگ و دو کی مناسبت سے اسے تلاش کر سکے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اپنی ذات (جان) پر غور کرو تو خالق کو پہچانو گے۔ اسی حوالے سے ارشاد ہوا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقَ (العلق:۲)

(جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔)

تو گویا علق انسان کا پہلا مرحلۂ حیات ہے اور یہیں سے انسان کی تحقیق کا آغاز ہوتا ہے۔ البتہ تحقیق یہیں پر رُکی نہیں بلکہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ اور اب تو سائنسدان یہ تک کہنے لگے ہیں کہ علق حیاتِ انسانی کا اوّلین مرحلہ ضرور ہے مگر اس میں بھی تحقیق کی نظر سے دیکھا جاسکے گا کہ اس معمولی سے حیاتیے سے وجود میں آنے والا انسان شکل و شباہت اور اخلاق وکردار میں کیسا ہوگا؟ اس میں کیا کیا صلاحیتیں مستور ہیں؟ اور یہ اپنی دنیاوی زندگی میں کیا کیا کارنامے سرانجام دے گا؟ یہ سب کچھ اس خوردبینی حیاتیے میں تحریر ہوتا ہے شاید ایک مدّت قبل انسان اس فلسفۂ حیات کو سمجھ نہ پایا، لیکن آج جب وہ اپنی آنکھوں سے ایک معمولی سی چپ میں طویل پروگرام ملاحظہ کرسکتا ہے، تو انسان کے ڈی این اے میں مستور پروگرام پر یقین کرنے میں کوئی شے حائل نہیں ہوتی۔ اُس وقت تک یہ حقیقت انسان پر منکشف نہیں ہوتی جب تک کہ یہ ذرّہ بڑھتے بڑھتے اس کی بصارت کی حد میں نہیں آجاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ فِیْ الْاَرضِ آیاتٌ لِّلمُو قِنِینَ • وَفِی اَنْفُسِکُمْ، اَفَلَا تُبصِرُون.   (الذاریات:۲۰،۲۱)

(زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی، کیا تم کو سوجھتا نہیں؟)

ذرا آیت مبارکہ پر غور کیجیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے مفہوم سے واضح ہے کہ نہ سائنس مذہب کے راستے میں حائل ہوتی ہے اور نہ مذہب سائنس کے راستے میں۔ جبکہ مذہب سائنس کو روشنی عطا کرتا ہے اور سائنس مذہب کے اصولوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس طرح ایمان قوی تر ہو جاتا ہے۔ یہ آیت ملاحظہ کیجیے:

اِ نَّ فِی خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَا لْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّیلِ وَ النَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِی تَجْرِی فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَابِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَاوَ بَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَ تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْارضِ لَآيَاتٍ لِّقَومٍ يَعْقِلُوْنَ   (البقرۃ:۱۶۴)

(جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔)

یہاں یہ امر واضح ہے کہ جو عقل رکھتا ہے اس کے لیے نشانیاں ہیں، اور جو عقل استعمال نہیں کرتا اس کے لیے ان نشانیوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

جب تک مسلمانوں نے عقل استعمال کی، وہ اس جستجو میں نظر آئے کہ زمین کا محور کہاں ہے۔ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش بھی کی کہ پہاڑوں کے اندر کیا کچھ ہے، ستاروں کی گردش کا راز بھی انہوں نے ہی جاننا چاہا۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت تک رہا جب تک عقل استعمال کی جاتی رہی۔ اور پھر مسلمانوں نے عقل کسی اور گروہِ انسانیت کے حوالے کردی۔ جب مسلمانوں نے دنیا کی قیادت کے لیے درکار صلاحیتوں کو ضائع کردیا تو قدرت نے قیادت کی ذمہ داری دوسری قوموں کو دے دی۔ ''پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے''۔

مندرجہ ذیل آیات کے ایک ایک لفظ پر بھی ذرا غور کیجیے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ   (الروم:۲۰)

(اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے بنایا)

صلاحیتِ کار کے حوالے سے مختلف خطوں کی مٹی میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب کی مٹی زرخیز ہے، مگر بلوچستان کی مٹی

بنجر ہے۔لیکن ذرا اس زمین میں جھانک کر تو دیکھو! اس میں معدنیات کے کیسے کیسے بے بہا خزانے مستور ہیں۔اتنے بھرپور خزانے ہیں کہ کئی ملکوں کی نگاہیں اس خطے پر لگی ہوئی ہیں، اور وہ (خاکم بدہن) ایسی ایسی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں کہ خدانخواستہ کسی طرح اس خطے کو ہتھیا لیں۔ابھی سے بندر بانٹ کے منصوبے ظاہر ہو رہے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے زمین کے اندر کے خفیہ خزانوں کو برقی آلات کی آنکھ سے دیکھ لیا ہے۔اس لیے جس طرح انسان متنوع ہیں، اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے بنایا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی نسل کو زمین پر پھیلانے لگا۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُم أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَومٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم:۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔)

اہلِ فکر وہ ہیں جو اپنی سوچ کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ (الروم:۲۲)

(آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں کا فرق اس (اللہ) کی نشانیاں ہیں)۔

کاش پاکستانیوں کو آیت مبارکہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو سمجھنے کی توفیق ہو سکے۔یعنی زبانوں کا اختلاف لسانی تعصب کی بنیاد نہیں بننا چاہیے، کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔کیونکہ زمین وآسمان کی طرح انسان کی زبانوں کی تخلیق بھی اُسی قادرِ مطلق نے فرمائی۔میں زبان دانی کے طالب علم کی حیثیت سے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں کچھ نہ کچھ ما بہ الاشتراک ضرور موجود ہے۔ان میں فرق ظاہری ہے جبکہ ان کا باطن ایک ہے۔یہ اس طرح آپس میں جڑی ہوئی ہیں جیسے کرۂ ارض کے پہاڑی سلسلے کہیں نہ کہیں سے باہم منسلک ہیں۔جیسے پہاڑوں نے زمین کو جکڑ رکھا ہے، اسی طرح زبانوں کے جال نے عالمِ انسانیت کو احاطے میں لے رکھا ہے۔دو مختلف زبانوں کے درمیانی علاقوں میں آپ کو ایسی زبان ضرور ملے گی جس نے دونوں کے درمیان پل کی حیثیت اختیار کر رکھی ہوگی۔یہ سب زبانیں اللہ نے بنا رکھی ہیں۔کسی بھی زبان کی تشکیل کے حوالے سے آج تک کسی ایسی زبان کا سراغ نہیں لگایا جا سکا جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ فلاں فلاں دس پندرہ افراد ہیں جنہوں نے اس زبان کی بنیاد رکھی۔زبانیں موسموں کی طرح خود بخود وجود میں آتی ہیں۔رنگوں کے اختلاف کی طرح زبانوں میں تنوع کا حسن بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِن آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (الروم:۲۳)

(رات اور دن کے اوقات میں تمہارا سونا بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے)

اور اس میں شک نہیں کہ نیند اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔دنیا میں موجود کوئی دوا اور کوئی غذا انسان کو وہ راحت نہیں دے سکتی جو بڑی سے بڑی تھکان کے بعد نیند سے میسر آ سکتی ہے۔اگر ایسا ہوتا تو انسان اپنے وسائل حیات میں اضافے کے لیے مسلسل جاگتا اور نیند کی کمی ادویہ یا غذاؤں سے پوری کر لیا کرتا۔دوسری طرف سارے دن کا تھکا ماندہ شخص چار پانچ گھنٹے سو جائے تو ساری تھکان اتر جاتی ہے اور وہ شخص پھر سے تر و تازہ ہو جاتا ہے۔

آسمان میں چمکنے والی بجلی اور برسنے والے پانی میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانیاں (آیات اللہ) ہیں۔(الروم:۲۴) اور اس جملے پر غور

فرمایئے:

وَ مِنْ آيَاتِهِ أن تَقُومَ السَّمَاءُ وَ الْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ اِذَاأَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ   (الروم:۲۵)

(اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اورزمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا،
بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔)

اگر آپ نے ایک ڈاکومنٹری فلم "The Mummy's Return" دیکھی ہوتو آپ کواندازہ ہوگا کہ اس فلم میں دکھائے گئے منظر میں بالکل اس آیت کے مفہوم کی منظرکشی کی گئی ہے، جس میں ممیوں کو یوں زمین سے برآمد ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے جیسے زمین سے پودے اچانک اُگ آتے ہیں۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی سائنس ہے۔ بقول اقبال

ہر کہ محسوسات راتسخیر کرد   عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

جس کسی نے بھی اپنے احساسات پرگرفت حاصل کرلی وہ ایک ذرے سے ایک جہان تعمیر کرسکتا ہے۔

کوہ وصحرا، دشت ودریا، تختۂ تعلیم اربابِ نظر

کوہ وصحرا اور دشت ودریا اہلِ نظر کے لیے ایک کھلی کتاب ہے (جس سے وہ اکتسابِ علم کرتے ہیں)۔ اسی منظر کے ذریعے وہ خشکی و تری اور نباتات و جمادات کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تحقیق کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ گویا یہ ان کے لیے باقاعدہ ذرائعِ علم ہیں۔ اسی لیے

برگ وسازِ ما کتاب وحکمت است   ایں دوقوت اعتبارِ ملت است

میرا رزق اور میرا سرود وساز دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک کتاب اور دوسری حکمت (دانائی) جس کسی قوم نے ان دو ذرائع سے استفادہ کیا اقوامِ عالم میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔

ایں فتوحاتِ جہانِ ذوق وشوق   آں فتوحاتِ جہانِ تحت وفوق

یعنی کتاب کی دنیا کا شوق اس جہانِ فانی میں فتوحات کے دروازے کھولتا ہے، مگر حکمت اور دانائی پر مبنی شوق انسان کے لیے تسخیرِ کائنات کی راہیں متعین کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اُسے آسمان کی وسعتوں اور سمندر کی تہوں تک پہنچنے کی صلاحیت مہیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

''رات اوردن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں''۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَاماً وَ قُعُوداًوَعَلىٰ جُنُوبِهِمْ   (آل عمران:۱۹۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ کھڑے ہوں یا بیٹھے یا پہلو کے بل لیٹے، اللہ ہی کے ذکر میں مصروف رہتے ہیں)

ہم اپنے محدود دینی علم کی مطابقت سے کہہ سکتے ہیں کہ کھڑے ہوئے سبحان اللہ، لیٹے ہوئے الحمدللہ وغیرہ کہہ دینے سے یہ حرکات عبادت بن جاتی ہونگی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت بہت خوبصورت انداز میں فرمائی:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْض

([یعنی وہ لوگ] زمین وآسمان کی تخلیق میں غوروفکر کرتے ہیں)

اور وہ یہ غوروفکر سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے ہر وقت کرتے رہتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً

(اے ہمارے رب! آپ نے کوئی بھی شے بےکار میں پیدا نہیں کی)

سُبۡحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران:۱۹۱)

([بے شک!] تو پاک تر ذات ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچالینا)

یہ اظہار اسی غور وفکر کا نتیجہ ہے جس سے اس کی قدرت اور خلاقیت کا اعتراف کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا صحیح ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحبانِ علم ہیں۔ جن کے پاس علم نہیں وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان بھی نہیں سکتے:

کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)

پوری انسانی تاریخ کھنگالنے کے باوجود کوئی بھی ایسا انسان نہیں ملتا جو اس سے اختلاف کر سکے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے پہلے کا عرصۂ حیاتِ عالم بڑی سست روی سے گزرتا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے سالہا سال کی زندگی سوئی سوئی سی ہلکے ہلکے انداز میں سفر کر رہی ہو۔ اسی سست روی میں ہزاروں سال گزر گئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے فوراً بعد اصل سائنس (علوم) کا انقلاب شروع ہوگیا۔ جسے اللہ نے خاص مشیت کے تحت مسلمانوں کے درمیان قائم کیا۔ یہی سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور کچھ عرصہ بعد مقدمہ ابن خلدون منظرِ عام پر آیا جس میں عمرانیات، سیاسیات، تجارت، ریاست، صنعت، معیشت، تعلیم، تمام کے تمام علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمہ کی چھٹی جلد مکمل طور پر تعلیم کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں طب، فنون، تعمیرات وغیرہ سب کے بارے میں تحقیق کے نتائج منکشف کیے گئے ہیں۔ جاحظ عرب دنیا کا ایک ایسا عالم اور مفکر ہے جس نے زندگی کے تقریباً تمام علوم پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے نابغہ ہائے روزگار اس امت کو عطا کیے۔ حالانکہ اللہ رب العزت کے سامنے صرف اُمت نہیں بلکہ پوری زمین، بلکہ پوری کائنات ہے۔ ہمارے ہاں اگر ابن الہیثم، ابن سینا، آفندی اور جابر بن حیان جیسے سائنسدان پیدا ہوئے تو دوسری طرف چند صدیوں بعد ہی نیوٹن، گلیلیو اور نجانے کون کونسے نابغہ روزگار منظر عام پر آئے۔ اس مرحلے پر یہ نکتہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ماہر کسان کی طرح زمینوں کا انتخاب اور وقت کا تعین کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی بھی زمین میں کوئی بھی فصل ہر وقت بوئی نہیں جاسکتی۔ بلکہ ہر فصل کو ایک خاص موسم میں بونا نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے اور ہر فصل کے لیے ایک خاص موسم سازگار ہوتا ہے۔ ہر پھل کو بھی خاص زمین اور خاص موسم میں بویا جاسکتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جب بہشت سے علم کا درخت زمین پر اتارا (انسان کی شکل میں) تو اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے بڑا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا۔ یعنی اُس نے ہر اس قوم کو علم عطا کیا جو حوصلے اور عزمِ صمیم (commitment) کے اعتبار سے اس کی اہل ثابت ہوئی۔ اس منصب پر فائز ہونے کے لیے قوموں میں محنتِ شاقہ کیساتھ ساتھ غور وفکر اور تحقیق وجستجو کا مادہ اور حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک مسلمان ان صلاحیتوں کے حامل رہے، انہیں ترقی کے وسائل اور مواقع میسر رہے اور انہوں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے سر اپنے سامنے جھکا دیے۔ مگر جب اس قوم نے ان صلاحیتوں کو خیر باد کہا تو قیادتِ بنی نوع انسان کی ذمہ داری دوسروں کی طرف منتقل ہوگئی۔

مستقبل کی سائنس

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اب سائنس ترقی کی اس نہج تک پہنچ چکی ہے کہ مادہ توانائی اور توانائی مادے میں بدل رہی ہے۔ اس حوالے سے قرآنِ کریم کی اس آیت میں ایک خوبصورت اشارہ موجود ہے:

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ، اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ (النمل: ۴۰)

جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ بلقیس کا تخت اپنے دربار میں منگوانا چاہتے تھے اُس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام فلسطین

میں تھے جبکہ ملکہ بلقیس حضرموت (یمن) کی حکمران تھیں، اور دونوں کے مابین ہُدہُد کے ذریعے پیغام رسانی یا کم از کم حصولِ معلومات کا سلسلہ جاری تھا۔ دراصل ملکہ سبا (بلقیس) اپنے اعلیٰ عہدیداران کے ایک وفد کے ساتھ حضرت سلیمان کے پایۂ تخت میں آپؑ سے ملاقات کے لیے آنے والی تھی، جس کے باعث حضرت سلیمانؑ اُسی کا تخت منگوا کر اُسے حیران کر دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا جب اُنہوں نے درباریوں سے استفسار کیا کہ کون ایسا کر سکتا ہے تو ایک بہت بڑے عفریت (جن) نے دعویٰ کیا کہ جب تک آپ اپنا اجلاس برخاست کریں گے، تخت آپ کے قدموں میں ہوگا۔ مگر اس مرحلے پر مجلس میں ایک ایسا فرد موجود تھا جس کے پاس ''کتاب'' کے علم کا کچھ حصہ تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ طرفت العین (آنکھ جھپکنے کی دیر) میں اُسے یہاں لا سکتا ہے۔ اور جب یہ انکشاف ہو چکا ہے کہ مادی اشیاء توانائی میں بدل سکتی ہیں تو آج کا "Transmission of Material Objects" کا عمل اس آیت کی تفسیر بن کر سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ آئندہ سائنس کی ترقی جہاں ایسے واقعات کو معمول میں بدل سکتی ہے وہیں آیاتِ قرآنی کی تصدیق کا فریضہ بھی ان شاءاللہ سرانجام، دیتی رہے گی۔ اس نہج پر گفتگو کی مطابقت سے علامہ اقبال کے اس قول کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا: ''طبیعی سائنس میں بنیادی تبدیلی آرہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب مذہب اور سائنس آپس میں اس قدر ہم آہنگ ہو جائیں گے جس کے بارے میں اس سے پہلے کبھی خیال بھی نہیں گزرتا تھا۔''

ٹیکنالوجی

ٹیکنالوجی درحقیقت علم کو آگے بڑھانے اور اس کی ترویج کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی بے شمار صورتیں ابتدائی زمانے سے ہی مل جاتی ہیں۔ مثلاً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِي خَلَقَ .....الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق:۱-۴)

(اے رسولؐ! اللہ کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے [عالَم کو] تخلیق کیا۔.....اور انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا)

قلم وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے علم آگے بڑھتا ہے۔ البتہ ہر دور میں اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں انگلیاں قلم کا کردار ادا کرتی تھیں۔ پھر درخت کی ٹہنیوں اور پرندوں کے پروں سے کام لیا گیا اور آج یہ کام انسان لیزر پرنٹر سے لے رہا ہے جو قلم کی جدید ترین شکل ہے۔ نہ جانے آنے والے دنوں میں قلم کی کیا کیا شکلیں سامنے آئیں۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کاغذ کی سطح پر دیکھیں اور آپ کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنی آپ کے تصور اور تخیل کو تحریر کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قلم کے بیان سے گویا انسان کو (نہ صرف مسلمانوں کو) اسے آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔

نٓ وَالْقَلَمِ (القلم:۱)

(ن کی قسم اور قلم کی قسم)

سمع وبصر سے متعلق:

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (المومنون:۷۸)

(وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں.....)

دوسرے لیکچر میں غالباً اس کا ذکر آیا ہے کہ چند سال پہلے سماعت اور بصارت محدود تھی۔ اب یہ لامحدود ہوتی چلی جارہی ہے (لامحدود کا لفظ محاورتاً استعمال کیا گیا ہے، یعنی وسیع تر ہوتی جارہی ہیں کیونکہ لامحدود ذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے)۔ گویا سماعت اور بصارت کا دائرہ مصنوعی معلومات کی بدولت وسیع و بسیط ہوتا جارہا ہے۔ اب تو افلاک میں پھیلی کہکشائیں بھی انسان کے دائرہ بصارت کی حد میں آرہی ہیں۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے بعض الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جو ہر دور کے اعتبار سے ایک نیا مفہوم اختیار کر لیتے ہیں (یا انسان ان کے معانی میں ایک نئی وسعت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے)۔ مثلاً

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِن قُوَّةٍ　　(الانفال:۶۰)

(اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت مہیا رکھو۔)

یہاں قوت کا لفظ محلِ نظر ہے۔ آج کے مفہوم میں قوت کا مفہوم energy ہے۔ ایک زمانے میں قوت سے مراد فقط قوت بازو ہی لیا جاتا تھا۔ پھر اس قوت کا مظہر منجنیق قرار ہائی۔ وقت بدلا اور منجنیق کی جگہ توپ نے لے لی۔ اس کے بعد علی الترتیب ٹینک اور میزائل مظاہرِ قوت قرار پائے۔ ایک دفعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ ''قوت'' کی وضاحت یوں فرمائی:

''قوت کیا ہے؟ پھینکنے کی طاقت کا نام قوت ہے۔''

حالانکہ اُس وقت تلوار کا استعمال معمول کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارکہ کو چونکہ آفاقیت اور ابدیت کا مظہر ہونا تھا اس لیے آپؐ نے قوت کا وہ مفہوم بیان فرمایا جو آج بھی مستعمل ہے۔ اس وقت بھی وہ شخص قوت کا حامل قرار دیا گیا جو دور تک نیزہ پھینک سکتا ہے، یا جس کا تیر دور تک جا سکتا ہے۔ گویا throw کرنے کی طاقت کو قوت قرار دیا گیا۔ آج بھی دنیا میں وہ ملک سب سے زیادہ طاقتور ہے جس کے پاس زیادہ دور تک مار کرنے والے میزائل موجود ہوں۔ آئے دن زیادہ سے زیادہ فاصلے پر میزائل پھینکنے کے تجربات کا آپ ٹی وی پر مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، جو مختلف ممالک کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ پاکستان بھی قوت کی اس دوڑ میں شامل ہونے کے لیے پورا زور لگا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے بعض ''قوتوں'' کی نظر میں کھٹکنے بھی لگا ہے۔

ہمیں ہر صورت میں اس امر پر غور کرنا ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت کو تبدیل کیسے کریں؟ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے قبل ہمیں اپنی خامیوں کا ادراک کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے بعد ہی اصلاحِ احوال کا امکان پیدا ہوتا ہے۔